فرانز فینن : مابعد نوآبادیاتی فکر کا بنیاد گزار

(اُفتادگانِ خاک :خصوصی مطالعہ)

احتشام علی

Abstract :

Frantz Omar Fanon(July 20,1925 - December 6,1961) is recokned one of the most influential theorist of Post-Colonial studies.In this article an effort has been made to highlight the colonial situation and intellectual framework of Fanon.The article enables the reader not only to have a better understanding of Colonial discourses but also to see his history in a correct perspective.

مابعد نو آبادیاتی مطالعات دنیا کے مختلف علاقوں میں وقوع پذیر ہونے والی نو آبادیاتی صورتِ حال کو اُن سماجی اور ثقافتی رشتوں کے تناظر میں پیش کرتے ہے جو استعمار کاروں اور استعمار زدہ مقامی باشندوں کے مابین تشکیل پاتے ہیں۔ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہوگا کہ استعمار کار اور استعمار زدہ کے درمیان مخاصمت اور مفاہمت کی بیشتر صورتیں اُن مخصوص مفادات کی زائیدہ ہوتی ہیں جن کی خاطر استعمار کار نے مقامی آبادی پر اپنا تسلط قائم کیا ہوتا ہے۔استعمار کار اپنے مفادات کے مکمل حصول تک ایسے کلامیے اور بیانیے وضع کرتا رہتا ہے جو نو آبادیوں میں اُس کے قیام کا منطقی جواز فراہم کرتے ہیں۔یہی بیانیے اور کلامیے بعد ازاں ایک پراسرار قوت کی طرح مقامی آبادی کی روح میں سرایت کر جاتے ہیں اور ان کے اثرات سے باہر نکلنے کے لیے صدیاں درکار ہوتی ہیں۔مابعد نو آبادیاتی مطالعات ،نو آبادیاتی دور میں وضع ہوئے ایسے ہی بیانیوں اور کلامیوں کو طشت از بام کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔سماجی ،ثقافتی ،سیاسی،علمی،ادبی، سائنسی،معاشی اور تعلیمی سطوح پر در آنے والی بہت سی تبدیلیاں جنھیں استعمار کار مقامی باشندوں کے لیے انقلابی قرار دے رہا ہوتا ہے، بعض صورتوں میں اُس کے اجارہ کو مستحکم کرنے کا ہی ایک وسیلہ ہوتی ہیں۔

اردو میں مابعد نو آبادیاتی مطالعات کے آغاز کو ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا ہے اور اس ضمن میں جو تحریریں سامنے آئی ہیں اُن میں زیادہ تر ایڈورڈ سعید کی شرق شناسی کو بنیاد بنایا گیا ہے۔فرانز فینن کا شمار مابعد

نوآبادیاتی فکر کے بنیاد گزاروں میں ہوتا ہے لیکن اُردو ادب میں اُس کی فکر کے اطلاقی پہلوؤں پر نسبتاً کم توجہ دی گئی ہے۔ برِصغیر کے نوآبادیاتی ادب کو فینن کی فکر کے تناظر میں دیکھتے ہوئے طاقت کے اُن سماجی اور ثقافتی مظاہر کو با آسانی سمجھا جا سکتا ہے، جن کے ذریعے استعمار کار صدیوں سے رائج نظام، زبان، اقدار اور روایات کی کایا کلپ کر کے اپنے اجارے کی راہ ہموار کرتا ہے۔ فرانز فینن، نوآبادیاتی صورتِ حال کے پسِ پردہ جس اقتصادی حقیقت کی طرف توجہ مبذول کروائی تھی، اُسے آج بھی چھوٹی قوموں اور سامراجی طاقتوں کے مابین موجود کش مکش میں دیکھا جا سکتا ہے۔ خاص کر وہ تمام ممالک جو نوآبادی کے طور پر کبھی نہ کبھی استعمار کاروں کے زیرِ اثر رہے ہیں آج بھی کُلی آزادی سے محروم ہیں۔ نوآبادیاتی دور میں وضع ہوئے بعض کلامیے اتنے دُور رس اور پائیدار ثابت ہوئے ہیں کہ استعمار زدہ اقوام آج بھی بالواسطہ زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہیں۔ اس ضمن میں ہندوستان اور پاکستان کی مثال سب کے سامنے ہے، جہاں نوآبادیاتی زنجیروں کو ٹوٹے ۶۸ سال گزر چکے ہیں لیکن استعمار کاروں کی تہذیب، ثقافت، قانون، زبان اور لباس اُسی طرح رائج ہے۔ فرانز فینن (Frantz Fanon) کی فکر کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ وہ محض افریقہ میں قائم نوآبادیاتی نظام کو اُس کی جڑوں سے ہی نشان زد نہیں کرتا، بلکہ استعماری نظام کے مقابل اُن ردِ استعماری بیانیوں کے خدوخال بھی سامنے لاتا ہے جو ایک مقابل بیانیے (Counter Narrative) کے طور پر ردِ استعماری عمل (Decolonization) کا آغاز کرتے ہیں۔ برِصغیر کے نو آبادیاتی سیّاق میں فینن کی فکر اسی لیے حقیقت سے زیادہ قریب نظر آتی ہے کہ اِس میں اُن مدارج کو با آسانی دیکھا جا سکتا ہے جنھیں طے کرنے کے بعد استعمار زدہ باشندے بالآخر کار غلامی کا جوا اتار پھینکنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ فرنز فینن کی فکری بصیرتوں کی روشنی میں نوآبادیاتی عہد کے اُن کرداروں کا اصل چہرہ بھی قاری کے سامنے آ جاتا ہے جو مقامی باشندوں کو آزادی دلانے کی آڑ میں اپنے ذاتی مفادات کے حصول کی جنگ لڑ رہے ہوتے ہیں ذیل میں فرانز فینن کی فکر کا ایک اجمالی جائزہ پیشِ خدمت ہے:

فرانز فینن کا شمار مابعد نوآبادیاتی مطالعات کے بنیاد گزاروں میں ہوتا ہے۔ ۱۹۵۲ء میں شایع ہونے والی اُس کی پہلی کتاب *Peau Noire ,Masques Blancs* جس کا انگریزی ترجمہ *Black Skin White Masks* کے نام سے شائع ہوا مقامی باشندوں خصوصاً سیاہ فام باشندوں کی نفسیات پر مرتب ہونے والے منفی اثرات کو بنیاد بنا کر لکھی گئی تھی۔ اِس کتاب میں شامل نفسیاتی تجزیات استعمار کاروں کی کھینچی اُن لکیروں کا واضح شعور دیتے ہیں، جن کے زیرِ اثر مغلوب قوم کے باشندے شدید قسم کے روحانی، ذہنی اور نفسیاتی خلفشار میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس کتاب میں شامل بہت سے تجزیات اُس زمانے کی یادگار ہیں جب فینن الجیریا کے ایک ہسپتال میں اُن استعمار زدہ باشندوں کے نفسیاتی معالج تھے جنھیں فرانسیسی استعمار کاروں نے بہیمانہ تشدد کا نشانہ بنایا تھا۔ *Toward the African Revolution* کے مدوّن فرانسس میس پیرو (Francis Maspero) کے الفاظ میں:

> ''بہت سی نفسیاتی بیماریوں میں جب اُس (فینن) نے نوآبادیاتی مغائرت کے مظہر کو کارفرما دیکھا تو اُن پر اپنے طبی نوٹس اور مشاہدات کو اکٹھا کیا۔ جن سے اُس نے نوآبادیاتی صورتِ

حال اور مقامی روایات کے باہمی رشتوں کا کھوج لگایا''۔[۱]

ایک نفسیات دان اور اپنی تہذیب و ثقافت کے نباض کی حیثیت سے فینن کے اس کام کو نو آبادیاتی مطالعات میں اولین حیثیت حاصل ہے۔فینن کے خیال میں استعمار کاروں کے ہاتھوں متعارف ہونے والے کلامیے دیسی باشندوں کی سماجی دنیا کو اس طرح اتھل پتھل کرتے ہیں کہ ہر باشندہ ایک نوع کے وجودی بحران میں مبتلا ہو جاتا ہے۔نو آبادکار کی طرف سے متعین کی گئی نسلی شناخت مقامی باشندوں کو مسلسل ایک احساسِ کمتری میں مبتلا رکھتی ہے ۔ایسے میں اپنی ذات کی ازسرِ نو دریافت کے لیے دیسی (سیاہ فام) باشندے اپنے چہرے پر ایک ایسا سفید مکھوٹا چڑھانے پر مجبور ہو جاتا ہے، جو اُسے سماجی، معاشی اور معاشرتی سطح پر ترقی کے لیے استعمار کاروں کے انتہائی قریب لے جاتا ہے۔ برِصغیر کے نو آبادیاتی عہد میں بھی اس طبقے کی کارگزاریاں ہرگز ڈھکی چھپی نہیں تھیں، جسے فینن افریقی پس منظر میں نیگریفیکیشن (Negrification) کی اصطلاح کے ذریعے واضح کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اُس کے نزدیک دیسی باشندوں کو نسلی بنیادوں پر ''نیگرو'' (Negro) قرار دینا دراصل ایک ایسی تخصیص ہوتی ہے، جس کے بعد اِس سرزمین پر بچے باقی ماندہ افراد (استعمار کاروں) کو اپنے وجود کی من مانی تعریف کرنے کا اختیار مل جاتا ہے۔فینن اس پیچیدہ نو آبادیاتی حربے کے تدارک کی خاطر دیسی باشندوں کو اپنی ثقافت سے جڑے رہنے کی تلقین کرتا ہے، کیونکہ محض اسی ایک طریقے سے وہ استعمار کار کے غالب آتے کلچر اور نسلی منافرت کے مقابل کوئی مزاحمتی کلامیہ پیش کر سکتے ہیں۔

فینن نے اپنی دوسری کتاب *A Dying Colonialism* (L'An Cinq) میں دیسی باشندوں اور استعمار کاروں کے درمیان جاری کشمکش کے اُن مختلف مدارج پر روشنی ڈالی ہے جنھیں طے کر لینے کے بعد نو آبادیاتی زنجیریں ٹوٹتی چلی جاتی ہیں۔ اِس کتاب میں فرانسیسی نو آبادکاروں اور الجیریا کے مقامی باشندوں کے درمیان جاری کشاکش کا بیانیہ اس لیے اہم ہے کہ اس میں بکھرے ہوئے مقامی طبقات کو جبر کے خلاف اکٹھا کرنے کی تدبیروں کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔فینن کے بقول مقامی باشندے ہر قسم کی طبقاتی تقسیم کو بالائے طاق رکھ کر، جب آزادی کے حصول کے لیے مجتمع ہو جاتے ہیں تو اُن کے سامنے نو آبادکار کی حیثیت پرِ کاہ سے بھی کم رہ جاتی ہے۔مختلف ذرائع ابلاغ کے ذریعے استعمار کی چیرہ دستیوں کا شعور ایک برقی رو کی طرح مقامی باشندوں کے جسموں میں بجلیاں دوڑا دیتا ہے۔فینن اس ضمن میں اخبارات اور ریڈیو کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے کہ کس طرح یہ دونوں ذرائع ابلاغ، آزادی کی جنگ میں مقامی مجاہدین کی آواز کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ برِصغیر کے نو آبادیاتی عہد میں بھی اخبارات ،رسائل اور جرائد نے ردِ استعماری کلامیوں کے فروغ میں بنیادی کردار ادا کیا تھا۔ اودھ پنچ ،زمیندار، چٹان اور ہلال جیسے رسائل و جرائد نے استعمار کاروں کی چیرہ دستیوں کے خلاف رائے عامہ ہموار کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا تھا جس کے نتیجے میں اُنھیں مختلف تعزیروں اور پابندیوں کا بھی سامنا کرنا پڑا تھا۔فینن کے بقول اِن میڈیمز کا پیدا کردہ شعور مقامی مردوں کے ساتھ مقامی عورتوں کو بھی تحریکِ آزادی میں شامل ہونے پر اُبھارتا ہے۔مختلف ذرائع ابلاغ کے ذریعے جب آزادی کے لیے مزاحمت کرنے والوں کی داستانیں عام لوگوں تک پہنچی ہیں تو

استعمارکاروں کے خلاف صف آرا ہونے والوں کو قومی ہیروز کا درجہ مل جاتا ہے۔۔فینن کے بقول اس جدوجہد میں استعمارکار کے متعارف کرائے ہوئے ایسے کلامیے ازکار رفتہ ہوجاتے ہیں جن کا مقصد مغربی کلچر کو فروغ دے کر، مقامی باشندوں کو اُن کی مشرقی روایات اور اقدار سے محروم کرنا ہوتا ہے۔مقامی ثقافت،استعمارکار کی لائی ہوئی بدیسی ثقافت کے سامنے مزاحمت جاری رکھتی ہے اور بالآخر اُسے کلی نہیں تو جزوی طو پر بے دخل کرنے میں ضرور کامیاب ہوجاتی ہے۔فینن کے اپنے الفاظ دیکھیے :

> ''کسی بھی تہذیب کے بعض ستون انتہائی طاقتور ہوتے ہیں جن کے سہارے وہ کھڑی ہوتی ہے،انہیں اس قدر آسانی کے ساتھ نہیں ہلایا جا سکتا۔جب کہ استعمار نواز حلقوں کو مبالغہ آرائی کی حد تک اپنی کامیابی کی توقع ہوتی ہے''۲

فینن نے اس کتاب میں آزادی کی جدو جہد کے دوران مقامی باشندوں کو درپیش لسانی صورتِ حال پر دل کھول کر بحث کی ہے۔اُس کے بقول استعمارکاروں کی متعارف کرائی ہوئی زبان جو کبھی دیسی باشندوں کے لیے شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتی تھی،آہستہ آہستہ آزادی کی زبان میں تبدیل ہو جاتی ہے۔دیسی باشندے اس بات کا شعور حاصل کر لیتے ہیں کہ اپنا پیغام بین الاقوامی سطح تک پہنچانے کے لیے اُنھیں بدیسی زبان کو ہی بہ طورِ ہتھیار استعمال کرنا پڑے گا۔استعمار کار کی زبان(جس کے ذریعے وہ مقامی ثقافت اور تہذیب کو مسخ کرنا چاہتا تھا)وقت آنے پر مقامی باشندوں کے لیے ایک ایسے عالمگیر مظہر میں تبدیل ہو جاتی ہے جس کے ذریعے اُنھیں حکمرانوں کے مظالم کے خلاف بیرونِ ملک سے بھی اخلاقی حمایت ملنا شروع ہو جاتی ہے ۔برِصغیر میں بھی ابتدائی طور پر مقامی باشندوں نے انگریزی زبان سے یہاں تک احتراز کیا تھا کہ کچھ مقامی علماء نے انگریزی سیکھنے والوں کو دائرۂ اسلام سے خارج قرار دے دیا تھا،لیکن وقت گزرنے کے ساتھ جیسے جیسے مقامی باشندوں کو نوآبادیاتی صورتِ حال کی پیچیدگیوں کا احساس ہونے لگتا ہے ویسے ویسے اُن کے ملی ،سیاسی اورقومی شعور میں اضافہ ہوتا چلا گیا ۔ برِصغیر کے مقامی باشندوں کو اپنے حقوق کی جنگ لڑنے کے لیے۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کی شکل میں ایک ایسا سیاسی پلیٹ فارم ملا تھا جس نے آگے چل کر حقیقی معنوں میں ردِ استعماری روّیوں کو بنیادیں فراہم کیں ۔۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ اور دیگر سیاسی جماعتوں کے قیام کے بعد مقامی باشندے کو اس بات کا بخوبی علم ہو گیا تھا کہ اگر سیاسی جدو جہد کے ذریعے استعمارکاروں کو برِصغیر سے نکالنا ہے تو اُنھیں اپنی آزادی اور انقلاب کے نعرے کی گونج کو بین الاقوامی ایوانوں تک پہنچانا پڑے گا ۔اسی دوران میں مقامی سیاسی قیادت اُس نوجوان طبقے کے ہاتھوں میں آچکی تھی جو یورپ کے ہی بڑے تعلیمی اداروں سے انگریزی زبان میں ہی تعلیم حاصل کر کے پلٹا تھا۔اس زمانے میں انگریزی زبان کو ہی انگریز استعمار کے خلاف بہ طورِ ہتھیار استعمال کیا گیا تھا۔فینن ، الجیریا کی تحریکِ آزادی کے سیّاق میں جو اہمیت فرانسیسی زبان کو دے رہا ہے برِصغیر کی تحریکِ آزادی میں وہی اہمیت انگریزی زبان کو حاصل تھی۔فینن کے الفاظ دیکھیے :

> ''اب فرانسیسی زبان جاننا، سمجھنا اور اس میں سوچنا سازش کے مترادف نہ تھا جس کا جال آغاز

میں استعمار نے بچھایا تھا اور یہ آواز اب لوگوں کی اپنی آواز تھی۔۔۔ان کے ضمیر کی آواز۔۔۔آزادی کی آواز۔۔۔روشن خیالی کی آواز۔۔۔ظالم حکمرانوں کے خلاف پسے ہوئے طبقے کی آواز۔یہ آواز آزادی کو دبانے کی بجائے اس کے اظہار کا ذریعہ بن گئی''[۳]

فینن کی درج بالا دو کتابوں اور مختلف مؤقر جرائد خصوصاً ''المجاہد'' میں شائع ہونے والے اُن مضامین کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے جو بعدازاں (*Pour la Révolution Toward the African Revolution Africaine*) کے نام سے مدون ہو کر منظر عام پر آئے ،لیکن بین الاقوامی سطح پر فینن کو اصل مقبولیت اُس کی مشہورِ زمانہ تصنیف *The Wretched of the Earth* (*Les damnés de la terre*) کی اشاعت سے حاصل ہوئی ،جو اُس کی وفات سے کچھ عرصہ قبل ۱۹۶۱ء میں شایع ہوئی۔فینن کی اس کتاب نے اپنی اشاعت کے بعد فلسفے،نفسیات، سماجیات اور سیاسیات پر دُور رس اثرات مرتب کیے۔ سارتر(Jean-Paul Charles Sartre) اس کتاب کے دیباچے میں لکھتا ہے کہ''اینگلس کے بعد فینن پہلا آدمی ہے جس نے تاریخ کی حرکت کو دن کی واضح روشنی بخشی ہے''[۴] مصنف کی اپنی قومی اور ثقافتی شناخت سے قطع نظر دنیا میں جہاں کہیں بھی مقامی باشندے استعمارکاروں کے خلاف سینہ سپر تھے اُنھوں نے اس کتاب کے محاصلات سے استفادہ کیا تھا۔ The Wretched of the Earth جس کا اردو ترجمہ مارچ ۱۹۶۹ء میں محمد پرویز اور سجاد باقر رضوی نے کیا اس اعتبار سے بہت اہمیت کی حامل ہے کہ اس کتاب کی اشاعت کے بعد ہی علمی دنیا میں ردِ استعماری کلامیوں کی طرح پڑی۔فینن کی فکر اور نو آبادیاتی صورتِ حال کو اُس کے اصل سیّاق میں سمجھنے کے لیے اس کتاب کے مباحث کا مرکوز مطالعہ انتہائی ضروری ہے۔فینن کے خیال میں'' نو آباد یاتی دنیا مانویت کے اصول پر قائم ہوتی ہے''،فینن نے'' مانویت'' کی اصطلاح چھٹی صدی عیسوی میں ملکِ فارس میں زرتشتوں کے مقابل اُبھرنے والے مذہب 'مانی مت' سے مستعار لی تھی۔اِس مذہب کے بانی 'مانی' (۵۱۲ء۔۵۷۲ء) نے اپنی مذہبی تعلیمات کی بنیاد ثنویت کے اصول پر رکھی تھی جس کے تحت نور اور ظلمت، خیر اور شر دونوں ہی خدا کے روپ تھے۔فینن کے بقول نو آبادیاتی دنیا ثنویت پر استوار ہوتی ہے اور اس میں سارا زور اس بات پر صرف کر دیا جاتا ہے کہ آیا آپ کسی ایک نسل / نوع سے تعلق رکھتے ہیں یا نہیں۔ایک خاص نوع،نسل، رنگ اور مذہب سے تعلق رکھنے والے افراد کو وسائل پر اجارے اور اپنے مخصوص مقاصد کی تکمیل کا پورا حق حاصل ہوتا ہے جب کہ دوسری نسل اور نوع سے تعلق رکھنے والے افراد کو محض اتنے وسائل ہی فراہم کیے جاتے ہیں جن کا تعین پہلا ،یعنی استعمار کار طبقہ کرتا ہے۔فینن نو آبادیاتی صورتِ حال کو ایک نوع کی اقتصادی صورتِ حال قرار دیتا ہے اُس کے بقول:

'' نو آبادیاتی صورتِ حال کی اصل جدت وہ اقتصادی حقیقت ہے،جس میں اتنی شدید معاشی ناہمواری اور طرزِ زندگی کا اتنا بڑا فرق ہوتا ہے کہ انسانی صورتِ حال کی اس قدر پردہ پوشی کسی اور طریقے سے کبھی نہیں ہوتی۔۔۔نو آبادیات میں اقتصادیات کا زیریں نظام بھی ایک بالائی نظام ہوتا ہے۔سبب ہی نتیجہ ہوتا ہے۔آپ دولت مند ہیں اس لیے آپ سفید فام ہیں،آپ

سفید فام ہیں اس لیے کہ آپ دولت مند ہیں''۵

مندرجہ بالا صورتِ حال کے تناظر میں فینن نو آبادیاتی باشندے کو مسلسل ایک نوع کی احساسِ کمتری میں مبتلا قرار دیتا ہے ۔اُس کے نزدیک استعمار کار اور اس کی دنیا میں حائل بعد کا خاتمہ ہی اُسے دوبارہ شرفِ آدمیت کے درجے پر فائز کر سکتا ہے۔نو آبادکار تشویت پر استوار اس دنیا پر اپنا اجارہ مستحکم کرنے کے لیے پہلے پہل بذریعہ مفاہمت مقامی باشندوں کے دل میں تشکر اور احسان مندی کے جذبات پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔لیکن استعمار کار اور مقامی باشندوں کے درمیان حائل تہذیبی اور ثقافتی بعد اس خلیج کو پاٹنے کی بجائے مزید گہرا کرنے کا سبب بن جاتا ہے۔فرانز فینن دیسی باشندے کی ذہنی ساخت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اُس میں جنم لینے والی دو دُنیاؤں کی وضاحت ان الفاظ میں کرتا ہے:

''ایک ایسی دنیا جو درجات میں تقسیم ہے۔ایک بے حس ،مانویت کی دنیا ایک مجسموں کی دنیا،اس جنرل کا مجسمہ جس نے ملک فتح کیا، اس انجینئر کا مجسمہ جس نے پل بنائے،ایک ایسی دنیا جسے خود پر اعتماد بہت ہے''۶

نسلی امتیاز پر تقسیم ہوئی یہ دنیا دیسی باشندے کے لیے ایک خاص نوع کی کشش رکھتی ہے ۔کشش اور گریز کا یہی تضاد دیسی باشندوں کو ہمہ وقت ایک ایسے اعصابی ہیجان میں مبتلا رکھتا ہے کہ اُنہیں ہر وقت مقامی تہذیب، ثقافت اور مذہب خطرے میں محسوس ہوتا ہے۔کشش / گریز ،انجذاب / انحراف،مفاہمت / مخاصمت کے یہ متخالف جذبات اُس کی زندگی کو ہی نہیں بلکہ اُس کے خیالات ،اقدار ،اقدامات ،تحریروں غرض ہر چیز کو متاثر کرتے ہیں ۔'ہم' اور 'وہ' کی خلیج اُس کے اعصاب پر اتنے منفی اثرات مرتب کرتی ہے کہ وہ استعمار کار سے چھٹکارا حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اُس جیسا بننے کا خواب بھی دیکھنا شروع کر دیتا ہے ۔فینن کے بقول :

''دیسی باشندہ وہ مظلوم انسان ہوتا ہے جس کا مستقل خواب یہ ہوتا ہے کہ وہ ظالم بن جائے، معاشرتی نظم و ضبط کی تمام علامتیں۔۔۔پولیس،فوجی بیرکوں میں بگل کی آواز ،فوجی پریڈ اور لہراتے جھنڈے۔۔۔سب بیک وقت گھٹن پیدا کرنے والے، محرک دونوں ثابت ہوتے ہیں''۷

درج بالا صورتِ حال کو برِصغیر کے سیّاق میں سمجھنے کے لیے ہمیں میرٹھ چھاؤنی میں مئی ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد، دلّی کی طرف کوچ کرنے والی اُن دیسی افواج کو ضرور ذہن میں لانا چاہیے، جو برطانوی فوج کے بگل بجاتی،جھنڈے لہراتی اور یہاں تک کے ملکہ کی شان میں پڑھا جانے والا ترانہ دوہراتی دلّی میں داخل ہوئی تھیں۔

فینن نو آبادیاتی صورتِ حال کو رد کرنے کے لیے علمی سطح پر دیسی دانشوروں کا تجزیہ اس لیے ضروری خیال کرتا ہے تا کہ پتا چلایا جا سکے کہ وہ نو آبادیاتی کلامیوں کے زیرِ اثر کس قسم کی دانش کے پرچارک ہیں ۔ وہ کونسے ذہنی عوامل ہیں جن کے تحت 'ہم' اور 'وہ' کا فرق دہرا کر استعمار کار کے حق میں ذہنی فضا تیار کی جاتی ہے۔استعمار کار کی تہذیب ،ثقافت ،علم و دانش کے حق میں دلائل دے کر بعض دانشور ایسا فکری نظام ہی کیوں رائج کرنا چاہتے ہیں

جس میں استعمار کار اور اُس کی تہذیب سے مخاصمت کی بجائے مفاہمت کی راہ نکلتی ہے۔فینن کے خیال میں بعض دیسی دانشور اپنے ذاتی مفادات کے لیے استعماری سرمایہ داروں سے کوئی خاص ربط ضرور رکھتے ہیں۔ اِسی ربط کے نتیجے میں اُن کی تحریروں اور خیالات میں استعمار کار کی تاریخ،تہذیب اور ادب کے روشن پہلو نمایاں کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔فینن جن مفادات کے لیے مقامی دانشوروں کے سرمایہ داروں سے ربط کو ظاہر کر رہا ہے اُس کی ایک اور شکل اُن بڑے عہدوں اور خطابات کی صورت میں بھی ظاہر ہوتی ہے جن کے حصول کے لیے مقامی دانشور کو استعمار کاروں کا حلیف بننا پڑتا ہے۔

برِصغیر کے نوآبادیاتی ادب میں ہمیں ایسی تحریریں جا بجا نظر آتی ہیں جن کا واحد مقصد استعماری حکمرانوں کی قربت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔خصوصاً ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی کے فوراً بعد جو ادب تخلیق ہوا اُس کا واحد مقصد انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنا تھا۔اس ادب میں استعمار کاروں کو جہاں ایک نجات دہندہ کے رُوپ میں پیش کیا گیا وہیں مقامی حریت پسندوں کو تلنگوں / لٹیروں / پوربیوں / اوباشوں اور قمار بازوں کے القابات سے نوازا گیا۔مقامی تخلیق کاروں خصوصاً شاعروں نے اپنی اپنی جان بچانے اور چھوٹے چھوٹے ذاتی مفادات کے حصول کی خاطر نئے حکمرانوں سے مفاہمت کا کوئی موقع بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔اس دور میں لکھی جانے والی تحریریں اُس تاریخ کے مانند ہیں، جو بادشاہ، درباری مؤرخوں سے لکھوایا کرتے تھے۔ان تحریروں میں استعمار کار کی تاریخ ،سنہرے دور کی ایک ایسی علامت کے طور پر جلوہ گر ہوتی ہے جس کے سامنے ہر قوت ہیچ ہو جاتی ہوتی ہے نیز ان تحریروں میں استعمار کار کا امیج ایک ایسے مسیحا کے طور پر پیش کیا جاتا ہے جس کے جانے کی صورت میں ہر چیز نیست و نابود ہوسکتی ہے۔ایسے مقامی لکھاریوں کی نظر میں استعمار کار ایسا نجات دہندہ ہوتے ہیں ہے جسے قدرت نے ایک تباہ حال اور گراوٹ کا شکار قوم کی اصلاح کے لیے انعام کے طور پر بھیجا ہوتا ہے(یہ بھی تم پر خدا کا تھا انعام / کہ پڑا تم کو ایسی قوم سے کام۔حالؔی)۔فینن درج بالا صورتِ حال کو اُس کے اصل تناظر میں دیکھتے ہوئے اس حقیقت کو سامنے لاتا ہے کہ نوآبادیات میں استعمار کاروں کے رائج کیے ہوئے قوانین سے لے کر اُن کے اصلاحاتی ایجنڈے اور ادب پروری تک ہر چیز محض ذاتی فائدے کے لیے ہوتی ہے۔استعمار کاروں کے ہاتھوں اپنی تہذیب ،ثقافت ،روایات اور اقدار کو گروی رکھوانے کے بعد مقامی باشندوں پر آہستہ آہستہ اپنی قومیت کا اصل مفہوم اور آزادی کے معنی واضح ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔فینن کے خیال میں قومیت کا یہی شعور مقامی باشندوں کو از سرِ نو مجتمع ہو کر جدوجہدِ آزادی پر آمادہ کرتا ہے۔اُس کے الفاظ میں:

> ''عوام جو اپنے پیدائشی حقوق کھو چکتے ہیں، جو خانہ جنگی اور عداوتوں کے چھوٹے چھوٹے دائروں میں رہنے کے عادی ہو چکتے ہیں۔اب مختلف علاقوں میں قوم کے چہرے کو صاف اور شفاف کرنے کے لیے متانت کی فضا میں آگے بڑھتے ہیں''۸

ردِ استعماریت کے اِس ابتدائی دور میں فینن 'بے ساختگی' کو مقامی باشندوں کے لیے قوت سے تعبیر کرتا ہے اُس کے نزدیک قومی شعور میں اضافے کے بعد مقامی باشندے استعمار کار کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔آپسی

لڑائیوں کا خاتمہ ہونے لگتا ہے اور ایسے حالات پیدا ہونے لگتے ہیں جن سے استعمار کے پیر اُکھاڑنے میں مدد ملتی ہے۔ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں خصوصاً میثاقِ لکھنؤ کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں نے جس طرح یکجا ہو کر استعمارکاروں کے خلاف جدو جہد کا آغاز کیا تھا اُسے حقیقی معنوں میں قومی شعور کی بیداری کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے ۔ہوم رول سے کر تحریکِ خلافت اور تحریکِ ترکِ موالات تک مقامی باشندے جس طرح استعمارکاروں کے خلاف سینہ سپر ہوئے تھے اُس کے بعد آزادی کی منزل زیادہ دور معلوم نہیں ہوتی تھی۔ گاندھی جی نے فلسفۂ عدم تشدد کا حامی ہونے کے باعث جب سانحہ چوری چورا (سانحہ چوری چورا میں مقامی باشندوں نے ایک تھانے پر دھاوا بول کر اُسے آگ لگائی تھی جس کے نتیجے میں لگ بھگ ۲۲ سپاہی ہلاک ہو گئے تھے) کے بعد اس تحریک کے خاتمے کا اعلان کیا تو آزادی کی منزل بھی مقامی باشندوں سے کہیں دور چلی گئی تھی ۔خیال رہے کہ اُس کے بعد ایک مدت تک مسلمان اور ہندو کسی ایک پلیٹ فارم پر اکٹھے نہ ہو سکے ۔

اس واقعہ کا یہاں حوالہ دینے کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ فینن نوآبادیاتی صورتِ حال میں، استعمارکاروں کی بربریت کا مقابلہ کرنے کے لیے، تشدد کو اُس صورت میں ناگزیر قرار دیتا ہے جب کوئی اور چارہ باقی نہیں رہتا۔ استعمار کار مختلف قوانین اور طاقت کے بہیمانہ استعمال سے جب مقامی باشندوں کی عزتِ نفس کو قدم قدم پر مجروح کرتا ہے تو اُس کے ذہن میں مقامی باشندوں کا تصور کسی جانور کے مماثل ہوتا ہے۔ استعمارکاروں کی وضع کردہ ،نیگرو (Negro) یا نیٹو (Native) جیسی اصطلاحیں اُس مخصوص ذہنیت ہی کی عکاسی کرتی ہیں جس کے تحت وہ مقامی باشندوں کے ذہنی اور جسمانی استحصال کا حق اپنے پاس محفوظ کر لیتا ہے۔ پے در پے ٹھوکریں کھانے اور جانوروں سے بھی بدتر سلوک برداشت کرنے کے بعد دیسی باشندوں سے یہ امید رکھنا کہ وہ وقت آنے پر استحصال کنندہ سے تہذیب و شائستگی سے پیش آئیں گے فینن کے خیال میں ذرا بھی قرین قیاس نہیں ہے ۔نوآبادیاتی صورتِ حال میں جدوجہدِ آزادی کے دوران کسی بھی طرف سے بھڑکنے والی تشدد کی کوئی ایک چنگاری پورے سماج کو جلتے ہوئے جنگل میں تبدیل کر دیتی ہے۔ برِصغیر میں ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے دوران وقوع پذیر ہونے والے کئی واقعات اُس چنگاری ہی کے ہی مماثل تھے جس نے پورے برِصغیر کو خاک اور خون میں نہلا دیا تھا۔ یاد رہے کہ ۱۸۵۷ء میں اگر تمام دیسی باشندے یکجا ہو کر بڑے تشدد کی راہ اختیار کر لیتے تو تاریخ کا دھارا آج شاید کسی اور سمت میں رواں ہوتا۔ فینن نوآبادیاتی نظام کو ایک تشدد سے تعبیر کرتے ہوئے اس سے نجات کے لیے زیادہ برے تشدد کو ناگزیر قرار دیتا ہے، لیکن یہاں اُس کی سوچ میں ایسے استعمارکاروں کے لیے لچک نظر آتی ہے جو نو آبادیاتی صورتِ حال میں استعماری ہتھکنڈوں کا حصہ نہیں بنتے فینن کے بقول ''نوآبادکار ہمیشہ ایسا انسان نہیں ہوتا جسے قتل کر دینا چاہیے۔ استعماریوں کے انبوہ میں بہت سے ایسے افراد بھی ہوتے ہیں جو قوم کے بعض سپوتوں سے کہیں زیادہ بڑھ کر قومی جدو جہد کے قریب ہوتے ہیں''[۹]

فینن نوآبادیاتی عہد کی اقتصادی صورتِ حال کو زیرِ بحث لاتے ہوئے متوسط طبقے کی ذہنی حالت کے ساتھ ہی ''مقامی بورژوا طبقے'' کے کردار کو بھی سامنے لاتا ہے ۔مقامی بورژوا طبقہ ،مغربی بورژوا طبقے سے براہِ راست

منسلک ہونے کے باعث استعمارکاروں کو اپنے مفادات کے لیے ضروری خیال کرتا ہے ۔ یہ وہی طبقہ ہوتا ہے جو اپنے مالی مفادات کی خاطر نوآبادیاتی عہد کے خاتمے پر بھی مغربی بورژوا کے رائج کیے ہوئے استحصالی کلامیوں کو جاری رکھنے پر اصرار کرتا ہے۔نوآبادیاتی فکر کے ایک اور اہم پارکھ ایڈورڈ سعید،فینن کے درج بالا تصور کو انتہائی اہم قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں ::

> ''وہ پہلا بڑا سامراج مخالف نظریہ ساز تھا جسے اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ کٹر قومیت بھی سامراجیت کے تراشے ہوئے راستوں پر چل نکلتی ہے۔جس کی بدولت تسلیم شدہ حکومت میں بھی قومی بورژوا طبقہ اپنے اجارے کو خوب پھیلا سکتا ہے''۱۰

ڈی کولونائزیشن(Decolonization) یا ردِ استعماریت کے مختلف مدارج بیان کرتے ہوئے فینن نے مقامی بورژوا طبقے کی ذہنیت اور اُس پر مغربی بورژوا طبقے کے اثرات کو جس طرح نشان زد کیا ہے ، اُسے پیشِ نظر رکھتے ہوئے ،آزادی ملنے کے بعد ایک استعمارزدہ معاشرے کو مضبوط بنیادوں پر استوار کیا جا سکتا ہے۔ ردِ استعماریت کے ضمن میں فینن بورژوا طبقے کے علاوہ اُن سیاسی جماعتوں اور سیاسی لیڈران کے کردار کا بھی تعین کرنے کی کوشش کرتا ہے جنھوں نے آزادی کے بعد ایک نئے معاشرے کی باگ ڈور سنبھالنی ہوتی ہے۔فینن نئی قومی حکومت کا قیام عمل میں آتے ہی ایسے ردِ استعماری کلامیے وضع کرنے پر اصرار کرتا جو نوآبادیاتی عہد کے اثرات کو زائل کر سکیں۔قومی تہذیب کا فروغ ہی نو آزاد ملک کو اپنے ماضی کی اُن درخشاں روایات سے ازسرِ نو منسلک کر سکتا ہے جنھیں استعمارکاروں نے مسخ کرنے کی ہر ممکنہ کوشش کی تھی۔فینن کے الفاظ میں:

> ''استعماریت محض مقبوضہ ملک کے حال اور مستقبل پر تسلط جمانے پر ہی قناعت نہیں کرتی، استعماریت صرف عوام کو اپنی گرفت میں لے کر اور مقامی باشندوں کے ذہن کو صورت اور معنی سے خالی کر کے ہی مطمئن نہیں ہو جاتی، بلکہ ایک طرح کی غیر صحت مندانہ منطق سے کام لیتے ہوئے یہ مظلوم عوام کے پیچھے بھی پڑ جاتی ہے اور اسے مسخ کر کے بد ہیئت اور تباہ کر دیتی ہے''۱۱

فینن قومی تہذیب کی اہمیت پر زور دینے اور استعمارکار کی لائی ہوئی ثقافت کے منفی پہلوؤں سے بچنے کے لیے اپنی اصل ثقافتی جڑوں کی طرف مراجعت پر اصرار کرتا ہے۔اُس کے نزدیک نوآبادیاتی عہد ایک ایسا دور ہوتا ہے جس میں قومی دانشور دوغلے پن کا شکار ہو کر بیک وقت دو شناختوں کے بیچ اُلجھ کر رہ جاتا ہے۔جدید اردو ادب کا مطالعہ کرتے ہوئے بھی ہمیں بہت سے تخلیق کار اُس دوغلے پن یا دوغلیت(Hybridity) کا شکار نظر آتے ہیں جن سے ادبی متون انتہائی پیچیدہ ہو جاتے ہیں ۔ایسی صورتِ حال میں ایک تخلیق کار کے فطری اظہار کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔جوں جوں استعمارکاروں کے خلاف مزاحمتی اور ردِ استعماری روّیے پروان چڑھتے ہیں توں توں تخلیق کار اپنی حقیقی اور فطری شناخت کا تعین کرنے میں کامیاب ہوتے چلے جاتے ہیں۔ردِ استعماری کلامیے بالآخر اُنھیں اُس تہذیبی کوکھ سے منسلک کر دیتے ہیں جو اُن کی ذات کا اصل اظہاریہ ہوتی ہے۔فینن نوآبادیاتی عہد میں لکھی جانے والی مقامی ادیبوں کی تحریروں کو درج ذیل تین ادوار میں تقسیم کرتا ہے:

(۱) پہلے دور میں لکھی جانے والی تحریروں میں نو آبادیاتی تہذیب سے مخاصمت کی بجائے ایک ''غیر مشروط انجذاب'' کا عمل جابجا دکھائی دیتا ہے۔ اس دور میں مقامی ادیب نو آبادکاروں کے ادب سے براہِ راست اثرات قبول کر کے زیادہ تر اُنھیں کی طرح کا ادب تخلیق کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جدید اردو نظم نگاری کے ضمن میں برِصغیر میں انجمنِ پنجاب کے نظمیہ مشاعروں سے لے کر مغربی نظم کے تراجم کے فروغ تک کے زمانے کو ہم اس پہلے دور میں شامل کر سکتے ہیں۔

(۲) دوسرے دور میں ادیب اپنی ذات اور قومی شناخت کے گمشدہ حصوں کی بازیافت چاہتا ہے اور اس کوشش میں اسے وہ اپنے پرشکوہ ماضی کی اُن یادوں میں پناہ ڈھونڈتا ہے جب استعماری جبر کا دور دور تک نام ونشان نہیں تھا۔ فینن کے بقول ''بچپن کے گزرے ہوئے واقعات اس کی یادوں کی گہرائیوں سے نمودار ہوتے ہیں۔ مستعار جمالیات اور دیگر آسمانوں کے نیچے دریافت شدہ نظریاتِ زندگی کی روشنی میں پرانے قصے کہانیوں کی نئی تعبیریں ہونے لگتی ہیں'' [۱۲]۔ درج بالا سیاق میں بیسویں صدی کے اوائل میں سامنے آنے والی اُس قومی اور ملّی نظم نگاری کو نشان زد کیا جاسکتا ہے جس میں ماضی کا شکوہ ایک بار پھر اپنی جھلک دکھانے لگ گیا تھا۔ اِسی دور میں فینن ادب میں طنز و مزاح اور تمثیلی عناصر کے فروغ کو مشکلات، مایوسی اور شکست جیسے تجربات کا ردِعمل قرار دیتا ہے۔ برِصغیر کے نو آبادیاتی عہد کے دوسرے دور میں تمثیل نگاری کے علاوہ ہمیں پنچ اخباروں خصوصاً اودھ پنچ کی شکل میں وہ طنزیہ و مزاحیہ عناصر پروان چڑھتے نظر آتے ہیں جن کی ساخت پرداخت میں سب سے اہم کردار نو آبادیاتی عہد کی تعزیروں اور پابندیوں نے ادا کیا تھا۔ مقامی نظم نگاروں میں اکبر الٰہ آبادی کی شاعری طنزیہ و مزاحیہ پیرائے میں استعمارکاروں کی تہذیب کے خلاف بلند ہونے والی سب سے توانا آواز ہے۔

(۳) فینن ردِ استعماری کلامیوں کے تناظر میں تیسرے دور کو حقیقی معنوں میں انقلاب اور بیداری کا دور قرار دیتا ہے اُس کے خیال میں حقیقی جنگجو، انقلابی اور قومی ادب اسی دور میں تخلیق ہوتا ہے۔ مصوری، مجسمہ سازی اور شاعری سمیت تمام فنونِ لطیفہ جو نو آبادیاتی جبر سے متاثر ہو کر اپنا اصل رنگ ڈھنگ کھو چکے ہوتے ہیں اِس آخری دور میں پھر سے اپنی روایت اور تہذیب کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔ خصوصاً شاعری جو فینن کے بقول ''ایک داخلی جبر اور ایک خارجی انتخاب سے جنم لیتی ہے'' [۱۳]، ایک نئے رنگ اور آہنگ سے اُبھر کر سامنے آتی ہے۔ مقامی شاعر جو پہلے پہل نو آبادکار کے دیے ہوئے کلامیوں سے مرعوب ہو کر شاعری کر رہا ہوتا ہے اب اچانک ہی عوام کے مسائل کو باریک بینی سے دیکھنا شروع کر دیتا ہے۔ اُس کے فن پارے کے موضوعات یکسر تبدیل ہو جاتے ہیں اور وہ مقامی تہذیب اور روایات کو اُن کے درخشاں ماضی کے ساتھ اپنی تحریروں کے قالب میں ڈھالتا ہے۔ فینن اس ضمن میں اس بات پر اصرار کرتا ہے کہ عوام کے لیے لکھنے والے ادیب کو چاہیے کہ وہ ماضی کو مستقبل کی راہیں کھولنے کے لیے استعمال کرے۔ قوم کو ماضی پرستی سے یاس کے اندھیروں میں دھکیلنے کی بجائے رجائیت کو اپنی تحریروں میں جگہ دے تا کہ عوام دوبارہ اپنے قدموں

پر اُٹھ کے، غلامی کا جوا اپنے کاندھوں سے اُتار پھینکیں۔ بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں برِصغیر میں جو اردو نظم لکھی گئی اُسے ہم قومی ادب کے تیسرے دور کے تحت دیکھ سکتے ہیں۔ مذکورہ عہد کے نظم نگاروں کی نظموں میں جہاں اپنے درخشاں ماضی اور مقامی ہیروز کی یادیں جگہ جگہ اپنے ہونے کا احساس دلاتی ہیں وہیں ردِ استعماری کلامیوں کی بھی طرح پڑتی ہے۔اس زمانے کی نظموں کا مرکوز مطالعہ کرتے ہوئے استعمار کے خلاف مقامی نظم نگاروں کے لہجے کی سختی کو با آسانی محسوس کیا جاسکتا ہے۔

اُفتادگانِ خاک کے آخر میں فرانز فینن نے بحیثیتِ نفسیات دان نوآبادیاتی عہد میں لڑی جانے والی جنگوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والے اُن نفسیاتی امراض پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے جو استعمارکار کے ذہنی اور جسمانی جبر کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں۔نوآبادیاتی صورتِ حال جو قومی شناخت اور مقامی تہذیب و ثقافت کو کچل کر سماجی عرصے میں اپنی جگہ مستحکم کرتی ہے فینن اُس سے نجات کے لیے مسلسل جدو جہد اور قومی تہذیب کے شعور کو ناگزیر قرار دیتا ہے۔ فینن کی فکر، نوآبادیاتی عہد میں وضع ہونے والے اُن تمام سماجی، ثقافتی، سیاسی اور ادبی کلامیوں کی چھان پھٹک پر اصرار کرتی ہے جن کا مقصد مقامی باشندوں کو احساسِ کمتری کا شکار بنا کر اپنے اجارے کی راہ میں حائل رکاوٹیں دور کرنا ہوتا ہے۔اُس کے الفاظ میں ''آیئے ہم یورپ کی نقالی ترک کرنے کا فیصلہ کرلیں۔آیئے ہم اپنے بازو اور اپنے ذہن ایک نئی سمت میں متحد کرلیں۔آیئے ہم اُس مکمل انسان کی تخلیق کریں جسے یورپ احساسِ فتح مندی کے ساتھ جنم دینے میں ناکام رہا ہے''(۱۴)۔ اپنی تہذیبی اور ثقافتی برتری کے برتے پر یورپ کو ایک کبیری کلامیے کے طور پر پیش کرنا نوآبادیاتی غلبے کو دوام بخشنے کے لیے ایک بنیادی حیثیت کا حامل ہے۔فینن مغربی نوآبادکاروں کی انھیں چیرہ دستیوں، بہیمانہ مظالم اور معاشی وسائل پر اجارے کی تدبیروں کو بے نقاب کرتے ہوئے محکوم قوموں کو اپنی تہذیبی و ثقافتی جڑوں کی بازیافت پر آمادہ کرتا ہے۔ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ فینن کے ہاں موجود نوآبادیاتی فکر کا زیادہ تر حصہ الجیریائی عوام کی آزادی اور سامراج کے خلاف افریقہ کی یکجائی کا خواب دیکھنے پر مشتمل ہے اور اس کی ایک بڑی وجہ فینن کا فکری اور علمی طور پر ہی نہیں بلکہ عملی طور پر بھی الجیریا کی جدو جہدِ آزادی میں شریک ہونا ہے۔یہی بات ہے کہ فینن کے ہاں بیان کیے گئے افکار پر اُس کی اپنی ذات کے تجربی تصور اور قومی تشخص کی گہری چھاپ نظر آتی ہے جب کہ ایڈورڈ سعید کی فکر زیادہ تر استعمار کار کے علمی کلامیوں کا احاطہ کرتی ہے۔سعید اپنے مطالعات کا دائرہ زیادہ تر شرق شناسی کی روایت تک محدود رکھتا ہے اور اِسے مشرق پر مغرب کی حکمرانی کا اختیار رکھنے کی تشکیل قرار دیتا ہے جب کہ فینن کے ہاں نوآبادیاتی صورتِ حال کو اُس کے معروضی سیّاق میں دیکھتے ہوئے ردِ استعماری کلامیوں کو بھی پیشِ نظر رکھا جاتا ہے۔اُردو میں مابعد نوآبادیاتی مطالعات کرنے والوں کے لیے فرانز فینن کی فکر یقیناً فکر و فن کے نئے دریچے وا کرنے کا باعث بن سکتی ہے۔

حوالہ جات وحواشی:

(1) Francis Maspero, *Toward the African Revolution*(Frantz Fanon),New York: Groove Press, 1994, P.VII

فرانسس میس پیرو کی رائے یہ ہے:

"He collected clinical notes and analyses on the phenomena of colonialist alienation seen through mental diseases. He explored local traditions and their relations to colonization."

۲۔فینن فرانز۔افتاد گانِ خاک،(مترجم:محمد پرویز،سجاد باقر رضوی)،لاہور:نگارشات، مارچ ۱۹۶۹ء،ص۵۰۔
۳۔فینن فرانز۔سامراج کی موت،مترجم:خالد محمود ایڈووکیٹ،لاہور:فکشن ہاؤس،۲۰۱۲ء،ص۱۰۸
۴۔سارتر،ژاں پال۔''دیباچہ''مشمولہ،افتاد گانِ خاک ازفرانز فینن (مترجم:محمد پرویز،سجاد باقر رضوی)،ص۱۳
۵۔فینن فرانز۔افتاد گانِ خاک،(مترجم:محمد پرویز،سجاد باقر رضوی)،ص۶
۶۔فینن فرانز۔افتاد گانِ خاک،(مترجم:محمد پرویز،سجاد باقر رضوی)،ص۱۹
۷۔فینن فرانز۔افتاد گانِ خاک،(مترجم:محمد پرویز،سجاد باقر رضوی)،ص۲۱
۸۔فینن فرانز۔افتاد گانِ خاک،(مترجم:محمد پرویز،سجاد باقر رضوی)،ص۱۰۵
۹۔فینن فرانز۔افتاد گانِ خاک،(مترجم:محمد پرویز،سجاد باقر رضوی)،ص۲۰

(10) Edward Said, *Culture and Imperialism*, London: Vintage, 1994, p328.

ایڈورڈ سعید کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

"He was the first major theorist of anti-imperialism to realise that orthodox nationalism followed the same track hewn out by imperialism, which while it appeared to concede authority to the nationalist bourgeoisie was really extending its hegemony."

۱۱۔فینن فرانز۔افتاد گانِ خاک،(مترجم:محمد پرویز،سجاد باقر رضوی)،ص۱۸۵
۱۲۔فینن فرانز۔افتاد گانِ خاک،(مترجم:محمد پرویز،سجاد باقر رضوی)،ص۹۶
۱۳۔فینن فرانز۔افتاد گانِ خاک،(مترجم:محمد پرویز،سجاد باقر رضوی)،ص۲۰۰
۱۴۔فینن فرانز۔افتاد گانِ خاک،(مترجم:محمد پرویز،سجاد باقر رضوی)،ص۲۹۳